ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

حکمتِ اقبال (۱۱)

سائنس کی مادّیات کو پہلا چیلنج

سائنس کی مادیات پر سب سے پہلے جس فلسفی نے شدید اعتراضات کیے وہ انگلستان کا بشپ جارج برکلے تھا۔ جس نے کہا کہ مادی دنیا اپنی کوئی جدا ہستی نہیں رکھتی کیونکہ ہم اسے فقط حواس کے ذریعہ سے جانتے ہیں، اور یہ جاننا شعور کے بغیر ممکن نہیں چونکہ ہمارے شعور سے باہر مادّہ کی کائنات کا اپنا کوئی وجود نہیں ہو سکتا اس لیے جو چیز حقیقتاً موجود ہے وہ شعور ہے نہ کہ مادّہ۔ حواس کے ذریعہ سے ہمیں جس چیز کا علم حاصل ہوتا ہے وہ مادّہ نہیں بلکہ فقط رنگ، صورت، شکل، آواز، نرمی اور سختی وغیرہ مختلف اوصاف ہیں اور ان اوصاف کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ شعور ان کا احساس کرے اور شعور کے بغیر ان میں سے کوئی چیز بھی موجود نہ ہو سکے گی۔ پس مادہ کی حقیقت فقط شعور ہے۔ برکلے اپنے نظریہ کی روشنی میں ایک غیر فانی ابدی شعور کی ہستی کو ثابت کرنے کے لیے جو دلیل قائم کرتا ہے وہ اس طرح کی ہے:

"آسمان کے تمام ستارے اور زمین کی تمام چیزیں مختصر یہ کہ وہ تمام اشیا جو اس کائنات کی ترکیب میں حصہ لیتی ہیں شعور کے بغیر کوئی وجود نہیں رکھتیں اگر میں ان کا احساس نہ کروں یا اگر وہ میرے یا کسی اور مخلوق ہستی کے شعور کے اندر وجود نہ ہوں تو پھر یا تو ان کا کوئی وجود ہی نہیں یا ان کا وجود کسی ابدی شعور کے علم میں ہے۔"

نوتصوّریت

برکلے کی اس تصوّریت کو اس زمانے میں ایک جدید فلسفہ سے جسے نوتصوّریت کہنا چاہیے اور جس کے شارحین اٹلی کے دو فلسفی کروچے اور جنٹیلے ہیں، بہت مضبوط سہارا مل گیا ہے یہ دونوں فلسفی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کائنات روح اور شعور کے سوا اور کچھ نہیں۔ ان کا فلسفہ نہ صرف زمانہ کے لحاظ سے جدید ترین ہے بلکہ بہت سے حکماء کے خیال کے مطابق موجودہ زمانہ کے فلسفوں میں سے ایک نہایت ہی اچھوتا اور اثر انگیز فلسفہ ہے۔ یہ فلسفہ اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ ہمارے شعور کا احساس ہی ایک ایسی چیز ہے جس کی حقیقت کے بارہ میں ہمیں یقین ہو سکتا ہے۔ اس مفروضہ سے استدلال کرتے ہوئے ہم اس فلسفیانہ نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اگر کائنات کی حقیقت کوئی ایسی چیز ہے جسے ہم جان سکتے ہیں تو وہ لامحالہ ہمارے شعوری تجربہ یا احساس کے ساتھ مماثلت رکھتی ہے اور چونکہ خود شعوری ہمارا واضح ترین احساس ہے، اس لیے مادّی کائنات کی حقیقت بھی لازماً ایک اعلیٰ قسم کی خود شعوری ہے۔

اقبال کی تنقید

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے انیسویں صدی کے ماہرینِ طبعیات کے لیے اس قسم کے خیالات کو قبول کرنا ممکن نہ تھا کیونکہ ایسا کرنے سے قائم بالذات ازلی اور ابدی میکانکی قویٰ کے طور پر ان کے مادّی قوانین کی بنیادیں اُکھڑ جاتی تھیں ان قوانین کی بنیاد یہ عقیدہ تھا کہ مادّہ کا اپنا خارجی وجود ہے جو شعور کے افعال اور خواص پر ہرگز موقوف نہیں۔ اقبال لکھتے ہیں :

> ’طبعیات ایک تجرباتی علم ہے جو ہمارے حسّی تجربات سے بحث کرتا ہے۔ ماہرِ طبعیات کی تحقیق و تجسس کا آغاز و انجام محسوس مظاہرِ قدرت سے تعلق رکھتا ہے جن کے بغیر وہ اپنے دریافت کیے ہوئے حقائق کی صداقت کا امتحان نہیں کر سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ غیر مرئی اشیاء مثلاً جوا ہر کو بھی اپنے مفروضات میں داخل کرتا ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے بغیر وہ اپنے حسّی تجربات کی تشریح نہیں کر سکتا۔ گویا طبعیات کا علم فقط مادّی دنیا کا مطالعہ کرتا ہے جسے ہم اپنے

حواس کی مدد سے جان سکتے ہیں۔ یہ مطالعہ جن ذہنی اعمال و افعال پر یا جن روحانی یا جمالیاتی احساسات و تجربات پر موقوف ہے، اگرچہ وہ سب مل کر ہمارے تجربہ کی پوری وسعت کا ایک عنصر ہیں تاہم وہ طبعیات کے دائرہ تحقیق سے خارج تصور کیے جاتے ہیں اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ طبعیات کا مطالعہ مادّی کائنات تک یعنی کائنات کے اس حصّہ تک جس کا مشاہدہ ہم اپنے حواس سے کرتے ہیں، محدود ہے۔ لیکن جب میں آپ سے پوچھوں کہ آپ مادّی دُنیا کی کون سی چیزوں کا مشاہدہ کرتے ہیں تو آپ اپنے اردگرد کی معروف اشیاء کا ذکر کریں گے مثلاً زمین، آسمان، پہاڑ، کرسیاں، میز وغیرہ۔ جب میں آپ سے مزید یہ سوال کروں کہ ان اشیاء میں سے آپ خاص کر کس چیز کا مشاہدہ کرتے ہیں تو آپ کا جواب فوراً یہ ہوگا کہ ان کی صفات و خصوصیات کا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے سوال کا جواب دیتے ہوئے ہم اپنے حواس کی شہادت کی حقیقت کا ایک تصور قائم کرتے ہیں۔ اس تصوّر کا حاصل یہ ہے کہ اشیاء اور ان کے اوصاف الگ الگ چیزیں ہیں۔ یہ دراصل حقیقتِ مادّہ کا ایک نظریہ ہے یعنی محسوسات کی حقیقت اور ادراک کرنے والے شعور کے ساتھ ان کے تعلّق اور ان کے بنیادی اسباب کا نظریہ۔ مختصر طور پر یہ نظریہ حسبِ ذیل ہے۔

محسوسات (رنگ۔ آواز) ادراک کرنے والے ذہن کی حالتیں ہیں اور لہٰذا اگر قدرت کو خارج میں وجود رکھنے والی کوئی چیز قرار دیا جائے تو یہ قدرت کے دائرے میں نہیں آتیں۔ اس بنا پر وہ کسی معقول معنوں میں مادّی اشیا کی صفات نہیں ہوسکتیں۔ جب میں یہ کہوں کہ آسمان نیلا ہے تو میرا مطلب اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوسکتا کہ آسمان میرے ذہن میں نیلاہٹ کا ایک احساس پیدا کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ نیلاہٹ ایک صفت ہے جو آسمان میں پائی جاتی ہے۔ ذہنی حالتوں کی حیثیّت سے وہ تاثرات ہیں یعنی کچھ ایسے نتائج جو ہماری ذات میں نمودار ہوتے ہیں، ان نتائج کا سبب مادّہ ہے یا مادّی چیزیں ہیں جو ہمارے حسّی اعصاب اور دماغ کے ذریعہ سے ہمارے شعور پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہ مادّی سبب چھونے یا ٹکرانے سے عمل کرتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس میں صورت، حجم، ٹھوس پن اور مزاحمت کی صفات موجود ہوں۔

پہلا فلسفی جس نے اس نظریہ کی تردید کا کام اپنے ذمہ لیا کہ مادہ ہمارے حسی تجربات کا ایک نامعلوم سبب ہے، برکلے (BERKELEY) تھا۔ ہمارے زمانہ میں وائٹ ہیڈ نے جو ایک ممتاز ماہر ریاضیات اور سائنسدان ہے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ مادیت کا مروّج نظریہ بالکل بے بنیاد ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس نظریہ کی رُو سے رنگ و آواز وغیرہ فقط ذہنی حالتیں ہیں اور قدرت کا کوئی جزو نہیں، آنکھ یا کان میں جو چیز داخل ہوتی ہے وہ رنگ یا آواز نہیں بلکہ وہ ایتھر (ETHER) کی ناقابلِ دید امواج یا ہوا کی ناقابلِ شنید لہریں ہیں۔ قدرت وہ نہیں جو ہم اسے سمجھتے ہیں ہمارے ادراکات سراب کی طرح ہیں اور یہ کہنا ممکن نہیں کہ وہ قدرت کی صحیح بے نقابی کرتے ہیں۔

قدرت خود اس نظریہ کے مطابق دو حصّوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک ہمارے ذہنی تاثرات اور دوسرے وہ خارجی ناقابلِ فہم اور ناقابلِ امتحان موجودات جو ان تاثرات کو پیدا کرتے ہیں۔ اگر طبعیات فی الواقع مُدرک اور معلوم اشیاء کا کوئی مربوط اور صحیح علم ہے تو مادّہ کا مروّج نظریہ ترک کر دینا ضروری ہے اور اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے کہ یہ ہمارے حواس کی شہادتوں کو جن پر ایک ماہر طبعیات جو تجربات و مشاہدات سے سروکار رکھتا ہے کلی انحصار کرنے پر مجبور ہے، مشاہدہ کرنے والے کے ذہنی تاثرات سے زیادہ حیثیت نہیں دیتا۔ یہ نظریہ قدرت اور قدرت کا مشاہدہ کرنے والے کے درمیان ایسی خلیج حائل کر دیتا ہے جسے پاٹنے کے لیے اسے اس مشکوک مفروضہ کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے کہ یہاں کوئی ایسی نامعلوم چیز موجود ہے جو گویا بسیط فضا کے ایک برتن میں پڑی ہے اور کسی خاص قسم کے ٹکراؤ کے نتیجہ کے طور پر ہمارے احساسات کو پیدا کرتی رہتی ہے۔ پروفیسر وائٹ ہیڈ کے الفاظ میں یہ نظریہ قدرت کے ایک حصّہ کو محض ایک "خواب" اور دوسرے حصّہ کو محض ایک "اٹکل" بنا کر رکھ دیتا ہے۔ اس طرح سے طبعیات اپنی بنیادوں پر تنقید کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے بالآخر اس بات کی معقول وجہ پاتی ہے کہ اپنے ہی تراشے ہوئے بُت کو آپ ہی توڑ ڈالے۔ اس طرح سے تجرباتی نقطۂ نظر جو شروع میں گویا حکمیاتی مادّیات کو ضروری قرار دے رہا تھا، آخر کار مادّہ کے خلاف بغاوت پر ختم ہو جاتا ہے۔ حاصل یہ کہ چونکہ اشیا ایسی ذہنی حالتیں نہیں جو کسی نامعلوم چیز سے جسے ہم مادّہ کا نام دیتے ہیں پیدا ہو رہی ہیں لہٰذا وہ سچ مچ کے مظاہرِ قدرت ہیں جو قدرت کی حقیقت

ہیں اور جن کو ہم بالکل اسی طرح سے جانتے ہیں جیسا کہ وہ فی الواقع قدرت کے اندر موجود ہیں:

سائنسدانوں کے نئے تصوّرات

جب برکلے نے نیوٹن (NEWTON) کے طبعیاتی قوانین پر سب سے پہلے اعتراض اٹھایا تو سائنسدانوں نے ایک نفرت آمیز طعن و تشنیع کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ کسے خبر تھی کہ اس بحث میں کہ آیا مادّہ حقیقی ہے یا شعور، فلسفی جلد ہی سائنسدانوں پر غالب آجائیں گے اور وہ بھی سائنسدانوں کی اپنی ہی تحقیقات و انکشافات کی بدولت۔ فلسفی تو مدّت سے کائنات کی ایک ایسی تشریح پر مُصر تھے جو حقیقتِ شعور پر مبنی تھی۔ اگر ان کا نقطۂ نظر عام قبولیت حاصل نہ کر سکا تھا تو اس کی وجہ فقط سائنس ہی کی رکاوٹ تھی۔ لیکن اب بیسویں صدی کی سائنس کے انکشافات نے جن میں نظریۂ اضافیت نظریۂ ایٹم اور عالمِ حیات کے بعض حقائق شامل ہیں یہ رکاوٹ دُور کر دی ہے۔ طبعیاتِ جدید کی تحقیقات نے مادہ کو (جو کسی وقت ٹھوس، سادہ اور روشن حقیقت کا درجہ رکھتا تھا) اور اس کے ساتھ قوّت، حرکت، فاصلہ، وقت اور ایتھر کو محض لاشئی میں بدل دیا ہے۔ ڈاکٹر جوڈ (JOAD) کے الفاظ میں:

"جدید مادّہ ایک ایسی بے حقیقت چیز ہے جو ہاتھ نہیں آسکتی۔ یہ فاصلہ اور وقت کے مرکب کا ایک ابھار، برقی رو کا ایک جال یا امکان کی ایک لہر ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے فنا کے اندر کھو جاتی ہے۔ اکثر اوقات اسے مادّہ کی بجائے دیکھنے والے کے شعور کا ہی ایک پھیلاؤ سمجھا جاتا ہے۔"

ڈاکٹر اقبال لکھتے ہیں:

"لیکن مادّہ کے تصوّر کو جس شخص نے سب سے بڑی ضرب لگائی ہے وہ ایک اور ممتاز ماہر طبعیات حکیم آئنسٹائن (EINSTIEN) ہے جس کے انکشافات نے نوعِ بشر کی علمی دنیا کے اندر ایک دُور رس انقلاب کی داغ بیل ڈالی ہے۔ رسّل (RUSSEL) کہتا ہے "نظریۂ اضافیت نے 'وقت' کو 'فاصلہ۔ وقت' میں مدغم کر کے مادّہ کے قدیم تصوّر کو فلسفیوں کے تمام دلائل سے بڑھ کر شکستہ کیا ہے۔" عقلِ عام کے نقطۂ نظر سے مادّہ ایک ایسی چیز ہے جو مرورِ وقت سے نہیں بدلتا اور فضا میں حرکت کرتا ہے لیکن اضافیت کی جدید

طبعیات کی رُو سے یہ نظریہ بے بنیاد ہو گیا ہے۔ اب مادّہ کا کوئی جزو ایک ایسی قائم بالذات شئے نہیں جس کی فقط حالتیں بدلتی رہیں بلکہ وہ ایک دوسرے سے تعلق رکھنے والے متعدد واقعات کا ایک نظام ہے۔ مادّہ کا وہ پرانا ٹھوس پن جاتا رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ تمام خاصیات بھی جاتی رہی ہیں جن کی وجہ سے وہ ایک فلسفی کو گریز پا خیالات سے زیادہ حقیقی نظر آتا تھا۔"

پروفیسر روثر سے (ROUGHIER) نظریۂ اضافیت سے پیدا ہونے والے نتائج پر بحث کرتے ہوئے اپنی کتاب "فلسفہ اور طبعیاتِ جدید" میں لکھتا ہے:

"اس طرح مادّہ الکترانوں (ELECTRONS) میں تبدیل ہو جاتا ہے جو خود لطیف لہروں کی صورت اختیار کرتے ہوئے فنا ہو جاتے ہیں۔ گویا مادّہ کا مستقل نقصان اور قوت کا ناقابلِ تلافی انتشار عمل میں آتا ہے۔ دوامِ مادّہ کے اس ہمہ گیر اصول کی بجائے جو سائنسدانوں نے سائنس کی بنیاد قرار دیا تھا اور جو اسے قابلِ فہم بناتا تھا یعنی "نہ تو کوئی چیز وجود میں آتی ہے اور نہ فنا ہوتی ہے" اب ہمیں یہ متضاد اصول وضع کرنا چاہیے کہ "کوئی چیز وجود میں نہیں آتی، ہر چیز فنا ہو جاتی ہے۔" دنیا ایک آخری بربادی کی طرف بڑھی چلی جا رہی ہے اور ایتھر جس کے بارے میں ناحق یہ دعویٰ کیا جاتا تھا کہ وہ کائنات کا سہارا ہے، کائنات کی آخری قنوطیت ثابت ہوئی ہے۔"

ڈاکٹر ہیری شمٹ (HARRY SCHMIDT) نے اپنی کتاب "اضافیت اور کائنات" میں یہ بتاتے ہوئے کہ نظامِ عالم میں نظریۂ اضافیت کے داخل ہونے کے بعد کائنات کی کیفیت کیا ہوئی ہے بڑے مایوسانہ انداز میں لکھا ہے:

"فاصلہ اور وقت بے حقیقت ہو کر رہ گئے ہیں۔ خود حرکت بے معنی ہو گئی ہے۔ اجسام کی شکل و صورت ہمارے نقطۂ نظر پر موقوف ہو گئی ہے اور کائنات کی ایتھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی ہے۔ افسوس کہ تم نے خوبصورت دنیا کو ایک شدید ضرب کے ساتھ برباد کر دیا ہے اب یہ ٹوٹ پھوٹ چکی ہے اور اس کے ٹکڑے منتشر کر دیئے گئے ہیں۔ اب ہم ان ٹکڑوں کو فنا کے سپرد کرتے ہیں اور بڑے درد کے ساتھ اس حسن کا ماتم کرتے ہیں جو تباہ ہو گیا ہے۔"

مادّہ کی اصل

لیکن اگر مادّہ حقیقی اور پائیدار نہیں تو پھر مادّہ کی عدم موجودگی میں ہم مخلوقات کی اس بوقلمونی اور رنگارنگی کی وجہ کیا بتا سکتے ہیں جس میں جا بجا حسن کار، ہنر، مدعا، تناسب، ہم آہنگی اور بے خطا ریاضیاتی ذہن کے اوصاف کارفرما نظر آتے ہیں۔ یقیناً یہ سب شعور ہی کے اوصاف ہیں لہٰذا شعور ہی کائنات کی آخری حقیقت ہے جس سے دنیا جگمگا رہی ہے۔ مادّہ کے فانی ہونے کے بعد اب اس نظریہ کے لیے کہ کائنات کی آخری حقیقت شعور ہے نہ صرف راستہ صاف ہو گیا ہے بلکہ اب اس نظریہ کے تسلیم کرنے کے بغیر چارہ نہیں۔ آج شعور کو کائنات کی حقیقت قرار دینا عقلی طور پر اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ انیسویں صدی میں یہ ماننا ضروری تھا کہ کائنات فقط مادّہ سے بنی ہے۔ فلسفہ تو اپنی ساری تاریخ میں سائنس کی تائید کے بغیر بلکہ سائنس کی مخالفت کے باوجود کائنات کی روحانی توجیہہ پر اصرار کرتا رہا ہے اور فلسفہ کا یہ نظریہ قدیم سائنس کے مادّیاتی نظریہ سے کسی طرح کم معقول یا کم قابلِ قبول نہیں تھا لیکن اب سائنس بھی اس کی تائید میں وزن دار شہادت پیش کر رہی ہے۔ چونکہ مادّہ بے حقیقت اور فانی ثابت ہوا ہے لہٰذا طبعیات کے ماہرین محسوس کرنے لگے ہیں کہ اب وہ مادّہ کی دنیا کے اندر محدود رہ کر طبعیات کے مسائل کو حل نہیں کر سکتے اور مجبور ہیں کہ مادّہ کی دنیا سے آگے نکل کر صداقت کی جستجو کریں کیونکہ اب مادّہ کی حقیقت مادّہ سے پرے کی دنیا میں ہی معلوم کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انگلستان اور یورپ کے بہت سے ماہرین طبعیات مثلاً ریڈنگٹن، جینز، وائٹ ہیڈ، آئن سائن، شروڈنگر اور پلانک مادّی دنیا کی حقیقت کی وضاحت روحانی نقطۂ نظر سے پیش کر رہے ہیں اب وہ ماہرینِ طبعیات ہی نہیں بلکہ ماہرینِ ماورائے طبعیات بھی ہیں۔ ان سب سائنسدانوں کے دلائل اس مفروضہ کی تائید کرتے ہیں کہ کائنات کی حقیقت شعور ہے مادّہ نہیں۔ جوڈ (JOAD) لکھتا ہے:

> "سربرآوردہ سائنسدانوں کی نگاہ میں علم طبعیات کی ترقی کی موجودہ منزل ایسے نتائج کی طرف راہ نمائی کر رہی ہے جو قدیم مادّیات کے نتائج کے بالکل برعکس ہیں اور جو کائنات کی روحانی توجیہہ کی اتنی ہی پرزور تائید کرتے ہیں جتنی کہ آج سے پچاس سال پہلے سائنس کائنات کی مادّی توجیہہ کی تائید کرتی تھی۔"

نظریہ کوانٹم کے موجد پروفیسر پلانک کے ساتھ مسٹر جے ڈبلیو این سلیون کی ایک گفتگو ۲۶ جنوری ۱۹۳۱ء کے رسالہ آبزرور میں شائع ہوئی تھی اس میں پروفیسر پلانک کہتا ہے:

"میں شعور کو ایک بنیادی حقیقت سمجھتا ہوں اور مادّہ کو شعور کا نتیجہ سمجھتا ہوں۔ ہم شعور سے آگے نہیں جا سکتے۔ ہر چیز جس کا ہم ذکر کرتے ہیں یا جس چیز کو موجود تصور کرتے ہیں اُس کی ہستی شعور پر مبنی ہے۔"

سر آلیور لاج (OLIVER LODGE) لکھتا ہے:

"کائنات پر شعور کی حکومت ہے۔ خواہ یہ شعور کسی ماہر ریاضیات کا سمجھا جائے یا کسی مصور کا یا کسی شاعر کا یا ان سب کا یا ان کے علاوہ اوروں کا۔ یہی وہ حقیقت ہے جو ہستی کو معنی خیز بناتی ہے۔ ہماری روزمرّہ کی زندگی میں رونق پیدا کرتی ہے۔ ہماری اُمید کو بڑھاتی ہے اور جب علم ناکام رہ جاتا ہے تو یقین کے ساتھ ہمیں قوت بخشتی ہے اور تمام کائنات کو ایک لازوال محبت سے پُرنور بناتی ہے۔"

جیمز جینز کا معقول اِستدلال

سر جیمز جینز کا استدلال یہ ہے کہ مادہ سب کا سب ریاضیاتی نسبتوں کی صورت میں ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ ریاضیات کا دخل جس طرح ایک جوہر کی ہیئتِ ترکیبی میں نظر آتا ہے اسی طرح فلک کے نظامات میں بھی موجود ہے۔ ریاضیات کے قوانین جس طرح قریب ترین مادّی اشیاء پر حاوی ہیں اسی طرح کائنات کے دُور دراز حصّوں پر بھی حکمران ہیں۔ لیکن ریاضیات کا علم جو ہمیں اس وقت حاصل ہے وہ کائنات کے مطالعہ سے حاصل نہیں ہوا بلکہ ہمارے اپنے منطقی یا عقلی استدلال سے حاصل ہوا ہے جس کا کائنات کے مطالعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اپنی قوّتِ استدلال کی راہ نمائی میں اپنے ہی ذہن کی پیداوار کے طور پر قوانینِ ریاضیات کو مرتّب کرنے کے بعد جب ہم کارخانۂ قدرت پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ دیکھ کر ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ نہ صرف کائنات کی تعمیر ان قواعد کے عین مطابق ہوئی ہے بلکہ یہی قوانین اس کائنات کی آخری صورت ہیں۔ چونکہ مادّہ غیر حقیقی ہے اس لیے کائنات آخرکار قوانین ریاضیات کے ایک مجموعہ کے بغیر کچھ ثابت نہیں ہوتی۔ ہم نے ان قوانین کو جو ہمارے شعور

ہے باہر کی دنیا میں جاری وساری ہیں، خود بخود کیونکر دریافت کر لیا اور پھر یہ قوانین مادّی دنیا کی تعمیر میں خود بخود کیونکر کام آئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات ہماری طرح کے ایک شعور کی تخلیق ہے یہ شعور ہماری طرح ٹھیک ٹھیک ریاضیاتی یا منطقی انداز کے ساتھ سوچ سمجھ سکتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ خارج کی دُنیا اور ہمارا اپنا شعور دونوں اسی شعور عالم نے پیدا کیے ہوں۔ سر جیمز جینز اپنی کتاب "پُراسرار کائنات" میں لکھتے ہیں۔

"کائنات کسی مادّی تشریح کی متحمل نہیں ہو سکتی اور میری رائے میں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی اپنی حقیقت ایک خیال سے زیادہ نہیں۔ آج سے تیس سال پہلے ہم سمجھتے تھے یا فرض کرتے تھے کہ ہم ایک آخری میکانکی حقیقت کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں آج دنیا بڑی حد تک اس بات پر متفق ہے (اور جہاں تک علم طبعیات کے ماہرین کا تعلق ہے۔ اس رائے سے اختلاف تقریباً مفقود ہے) کہ علم کا دریا ایک غیر میکانکی حقیقت کی طرف بہہ رہا ہے۔ کائنات ایک بڑی مشین یا کل کی بجائے ایک بڑے تصور کی صورت میں نظر آنے لگی ہے۔ اب شعور کوئی ایسی چیز نہیں جو مادّہ کی دنیا میں اتفاقاً داخل ہو گئی ہو بلکہ اس کی بجائے ہم یہ گمان کرنے لگے ہیں کہ ہمیں شعور ہی کو مادّہ کی دنیا کا خالق اور حکمران قرار دینا چاہیے۔ ہمارے اپنے شعور کو نہیں بلکہ اُس شعور کو جس کے اندر وہ جواہر جن سے ہمارا شعور صورت پذیر ہوا ہے۔ خیالات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تازہ علم ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم اپنے پہلے جلد بازی سے قائم کیے ہوئے تاثرات پر یعنی یہ کہ ہم ایک ایسی دنیا میں آ پہنچے ہیں جو زندگی سے کچھ سروکار نہیں رکھتی یا زندگی سے عملاً عداوت رکھتی ہے، نظر ثانی کریں۔ اغلب ہے کہ مادّہ اور شعور کی قدیم دوئی جو اس فرضی عداوت کی ذمہ دار تھی بالکل ناپید ہو جائے گی، نہ اس لیے کہ مادّہ بے حقیقت ثابت ہو جائے گا یا شعور مادّہ ہی کی ایک خصوصیت بن جائے گا بلکہ اس لیے کہ ٹھوس اور حقیقی مادّہ آخر کار شعور ہی کی ایک مخلوق یا شعور ہی کا ایک ظہور مانا جائے گا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات ایک منظم اور مدبر ہستی کا پتہ دیتی ہے جو ہمارے شعور کے ساتھ کچھ نہ کچھ مشابہت رکھتی ہے۔ جس حد تک ہمیں علم ہو سکا ہے جذبات، اخلاق اور احساس کے اوصاف کے لحاظ سے نہیں بلکہ ایک ایسے انداز فکر کے لحاظ جسے ہم کسی بہتر لفظ سے تعبیر نہ کر سکنے کی وجہ سے ریاضیاتی

اندازِ فکر کہتے ہیں:

حیاتیات کے حقائق کی شہادت: برگسان اور ڈریش

تصوری اور نوتصوری فلاسفہ کے نظریات اور طبعیاتِ جدید کی شہادت کے علاوہ جن میں سے ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہر ایک کے اندر اس خیال کی پُرزور تائید موجود ہے کہ کائنات کی حقیقت شعور یا رُوح ہے، حیاتیات کے بعض حقائق بھی اس نتیجہ کی طرف راہ نمائی کرتے ہیں۔ ان حقائق کی بناء پر بعض منظم فلسفے قائم کیے گئے ہیں۔ جن میں سے ایک ارتقائے تخلیقی کا فلسفہ ہے جسے برگسان نے مدوّن کیا ہے۔ اور دوسرا اینٹی لیجی کا فلسفہ ہے جسے ڈریش نے پیش کیا ہے۔ مادّیت کے حامیوں کا خیال ہے کہ زندگی مادّہ کی ایک خاص حالت کے وصف کے سوا کچھ نہیں۔ جب مادّہ ایک خاص کیمیاوی ترکیب کو پالیتا ہے تو اس میں زندگی کی خاصیّت نمودار ہوجاتی ہے۔ حیوان جو اس طرح سے وجود میں آتا ہے ایک حسّاس مشین یا کَل کی طرح ماحول کی کیفیات سے متاثر ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کی جسمانی بناوٹ میں ایک تبدیلی ظاہر ہوتی ہے۔ جوں جوں ادوار گزرتے جاتے ہیں ماحول کی ان نو بہ نو کیفیات کے باعث جن سے حیوان کا سابقہ پڑتا رہتا ہے اس تبدیلی میں مزید اضافہ ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس طرح حیوانات کی نئی نئی اقسام وجود میں آتی رہتی ہیں لیکن حیاتیات کی تازہ تحقیقات اس نقطۂ نظر کی حمایت نہیں کرتیں۔ پروفیسر جے ایس ہالڈین کا خیال ہے کہ وہ حکما جو حیاتیات کا مطالعہ سنجیدگی سے کرتے ہیں اب اس بات کے قائل نہیں رہے کہ زندگی فقط مادّہ کی کسی خاص کیمیاوی ترکیب کا نتیجہ ہے۔ جرمنی کے ماہر حیاتیات ڈریش (DRIESCH) کے تجربات بالخصوص اس نتیجہ پر مجبور کرتے ہیں کہ ماحول کی خارجی کیفیات سے متاثر ہونے کے باعث جو حرکات ایک زندہ انسان سے سرزد ہوتی ہیں وہ ایک کَل یا مشین کی حرکات سے یکسر مختلف ہیں۔ کَل ایک بیرونی طاقت سے حرکت میں لائی جاتی ہے اور خود چند اجزاء کے مجموعہ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس حیوان جسم کی ایک خاص شکل وصورت حاصل کرنے اور قائم رکھنے کے لیے ایک اندرونی میلان کا اظہار کرتا ہے۔ یہ ایک مجموعۂ اجزاء کی طرح نہیں بلکہ ایک ناقابلِ تقسیم وحدت کی طرح عمل کرتا ہے جس کے اندر ایک رجحانِ طبیعت ایسا ہے جو اس وحدت کی ضروریات کی خبر رکھتا ہے۔ اگر ہم ایک کیکڑے

کی ٹانگ کاٹ دیں تو اس کی جگہ دوسری ٹانگ پیدا ہو جاتی ہے کوئی کل یا مشین اپنے ٹوٹے ہوئے پرزہ کو خود بخود مہیا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

ڈریش نے ایک جنین کو اس کی نشوونما کے شروع میں تجربہ کے لیے دو حصوں میں کاٹا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا ایک حصہ بھی نشوونما پا کر مکمل حیوان بن جاتا ہے خواہ جنین کو کہیں سے کاٹا جائے اور خواہ اس کے اس ایک حصہ کی نسبت کل کے ساتھ کچھ ہو۔ تجربہ کے نتائج میں کوئی فرق نہیں آتا اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ خلیات (CELLS) جو ایک مکمل جنین میں نشوونما پا کر سر بننے والے ہوں نامکمل جنین میں ٹانگ بن سکتے ہیں۔ دراصل جنین کا کوئی حصہ بڑھتے ہوئے حیوان کی ضرورت کے مطابق کسی عضو کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ ڈریش لکھتا ہے "یہ عجیب کل ہے جس کا ہر حصہ ایک ہی جیسا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک حصہ کل کی حیثیت کیونکر پیدا کر لیتا ہے۔ جنین کے اعضاء کی نشوونما میں بھی یہی اصول کام کرتا ہے۔ اگر ایک نیوٹ (NEWT) کی دم کاٹ دی جائے تو اس کی جگہ دوسری دم پیدا ہو جاتی ہے اور اگر دم ابتدا ہی میں کاٹ دی جائے اور ایک تازہ کٹی ہوئی ٹانگ کے بقیہ کے ساتھ جوڑ دی جائے تو دم دم کی شکل میں نہیں بلکہ ٹانگ کی شکل میں نشوونما پانے لگ جاتی ہے کائنات کے مادی اجزا کا ذکر کر کے ہم اس قسم کے حقائق کی کوئی تشریح نہیں کر سکتے۔ اس لیے ڈریش نے جنین کی نشوونما کی تشریح کرنے کے لیے اس مفروضہ کو بیکار سمجھ کو ترک کر دیا کہ زندگی طبعیات یا کیمیا کے خاص خاص قوانین کے عمل کا نتیجہ ہے۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہم حیاتیاتی ردِ عمل کو کسی میکانکی نقطۂ نظر سے نہیں سمجھ سکتے۔ اس کی نوعیت ایسی ہے جیسے ایک سوال کا معقول جواب یا ایک گفتگو کا کوئی ایسا حصہ جو کسی دوسرے حصہ کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو۔ حیاتیاتی ردِ عمل مکمل حیوان کا ردِ عمل ہوتا ہے اس کے کسی جزو کا ردِ عمل نہیں ہوتا۔ ضروری تھا کہ عمل حیات کی تشریح کے لیے کائنات کا ایک اور روحانی یا غیر مادی عنصر تصور کیا جائے، چنانچہ ڈریش نے طبعیاتی کیمیائی نظریہ کو رد کر کے اینٹی لیچی (ENTELECHY) کا ایک نیا نظریہ پیش کیا۔ اینٹی لیچی گویا ایک سوچی سمجھی ہوئی تجویز ہے جو کسی نہ کسی طرح حیوان کے اندر پوشیدہ ہوتی ہے اور اس کی قوتِ حیوان کی نشوونما کے دوران اس کے ہر ایک حیاتیاتی ردِ عمل میں نمودار ہوتی ہے۔ حیوان کے اندر ایک مدعا یا مقصد کام کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ ایک مناسب شکل و صورت اختیار کرتا ہے۔ مقصد یا مدعا ایک ایسی خود اختیار تدبیری اور انتظامی قوتِ شعور ہے

جو حیوان کے مجموعی مفاد کے لیے اس کو ڈھالتی اور بناتی ہے اور جو خود اپنے ارادہ کو بھی اس مفاد کے اقتضا کے مطابق بدلتی ہے۔ ضروری ہے کہ یہ قوت کائنات کے اندر زندگی کی ساری نشوونما اور ارتقا سے دلچسپی رکھتی ہو۔ برگسان اسی قوت کو قوتِ حیات (VITAL IMPETUS) کا نام دیتا ہے۔ اس کے نزدیک اس قوت میں اور شعور میں کوئی فرق نہیں۔ ڈریش نے بھی اینٹی لیچی کا تصور شعور اور نفسیات کے مطالعہ کے لیے استعمال کیا ہے اس کے نزدیک حیاتیات جسمِ حیوانی کی شعوری نشوونما کا مطالعہ ہے۔ حیوان کا کردار جس میں انسان کا کردار بھی شامل ہے، حیوان کی نشوونما سے ملتا جلتا ہے۔ دونوں ایک ہی مقصد یا مدعا کی طرف بڑھتے ہیں۔ جس طرح سے حیوان کی نشوونما کی سمت ایک انٹی لیچی سے متعین ہوتی ہے اس طرح اس کا کردار ایک مماثل نفسیاتی میلان سے مطمئن ہوتا ہے۔ یہ میلان تازہ جنم لینے والے حیوان کی ان مفید حیات حرکات میں نمودار ہوتا ہے جنہیں وہ کسی تجربہ سے نہیں سیکھتا۔ زندگی کے مطالعہ سے اس طرح کے بعض اور حقائق کا بھی پتہ چلتا ہے جو ڈریش کے نتائج کی تائید کرتے ہیں۔ برگسان نے ان حقائق کو اپنی کتاب ارتقائے تخلیقی (CREATIVE EVOLUTION) میں اس بات کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ زندگی کا مخفی محرک یا مدعا ہی روئے زمین پر حیوانات کی اوّلین پیدائش اور پھر رفتہ رفتہ ان کی بلند تر اقسام کے ظہور اور ارتقا کا باعث ہوا ہے۔

برگسان کا استدلال

لامارک (LAMARCK) نے حیوانات کے ارتقا کی وجہ یہ بتائی تھی کہ ضرورتی ہے کہ ایک زندہ حیوان کی جسمانی بناوٹ ماحول کی کیفیات سے مطابقت پیدا کرے۔ جب یہ مطابقت پیدا ہو جاتی ہے تو حیوان کے جسم میں ایک تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے جو اگلی نسلیں وراثتاً حاصل کرتی ہیں اور چونکہ یہ نسلیں خود بھی مجبور ہوتی ہیں کہ ماحول کے ساتھ جسمانی مطابقت پیدا کریں اس لیے موروثی تغیر میں اور اضافہ ہو جاتا ہے یہاں تک کہ حیوان کی ایک اور نئی قسم وجود میں آجاتی ہے۔

اوّل تو یہ نظریہ اُن حقائق کے خلاف ہے جو اب اچھی طرح سے ثابت ہو چکے ہیں کہ حیوان کے جسم میں ایک نمایاں تبدیلی آہستہ آہستہ جمع ہونے والی چھوٹی تبدیلیوں کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ فوری طور پر بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہ اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ حیوان کے اندر کوئی شعوری یا

غیر شعوری میلان ایسا موجود نہ ہو جس سے وہ ایک فوری تبدیلی اور اصلاح اختیار کر سکے۔

دوم۔ ماحول کے ساتھ جسمانی بناوٹ کو مطابق کرنے کی ضرورت ارتقار کے رک جانے کی وجہ بن سکتی ہے لیکن اس کے جاری رہنے کی وجہ نہیں بن سکتی۔ جونہی کہ ایک حیوان کی جسمانی ساخت ماحول کے ساتھ اتنی مطابقت حاصل کر لے کہ وہ اس کی وجہ سے اپنی زندگی کو قائم رکھ سکے تو اس کے مزید بدلنے یا ترقی کرنے کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے۔ اگر مطابقتِ ماحول فی الواقع زندگی کی حفاظت کے لیے عمل میں آتی ہے تو زندگی کی حفاظت کا انتظام ہو جانے کے بعد حیوان کو زیادہ منظم اور ترقی یافتہ اجسام کی طرف ارتقار نہیں کرنا چاہیے۔ برگسان لکھتا ہے:

"ایک چھوٹا سا جانور زندگی کے حالات کے ساتھ اتنی ہی مطابقت رکھتا ہے جتنا کہ ہمارا جسم کیونکہ وہ اپنی زندگی کو قائم رکھنے پر قادر ہے تو پھر زندگی ایک ایسے جانور کے مرحلے پر پہنچ جانے کے بعد فنا کے خطرات سے بے پرواہ ہو کر مزید ترقی کے راستے پر گامزن کیوں رہتی ہے! زندہ حیوانات کے بعض اجسام جو ہم آج دیکھتے ہیں دُور دراز زمانوں سے جوں کے توں چلے آتے ہیں اور ادوار کے گزرنے سے ان میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ تو پھر زندگی کو آج سے پہلے کسی خاص جسم حیوانی پر جا کر ٹھہر جانا چاہیے تھا لیکن جہاں جہاں ممکن تھا یہ رک کیوں نہ گئی ہے اگر خود اس کے اندر کوئی ایسی قوتِ محرکہ نہ تھی جو اسے خطرات کے باوجود زیادہ سے زیادہ تنظیم اور ترقی کی منزل کی طرف لے جانا چاہتی تھی تو پھر یہ آگے کس طرح بڑھتی گئی ہے"

یہ حقائق اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ شعور مادّہ سے پیدا نہیں ہوا بلکہ خود بخود موجود ہے۔ شعور خود ایک بنیادی حقیقت ہے اور مادّہ کی خاصیات کا مظہر نہیں۔ اگر شعور اپنی جُدا حقیقت رکھتا ہے تو مادّہ کے بے حقیقت ثابت ہونے کے بعد ہم آسانی سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ کائنات کی ساری حقیقت بھی یہی ہے اور مادّہ اسی سے ظہور پذیر ہوا ہے۔ جس طرح سے حیوانات کی مختلف قسمیں عملِ ارتقار سے وجود میں آئی ہیں اس طرح سے مادّہ کی موجودہ حالت بھی عملِ ارتقار کا نتیجہ ہے۔ جو قوتِ حیوانات کے ارتقار کا سبب ہے وہی مادّہ کے ارتقار کا باعث بھی ہے۔ لہٰذا مادّہ کی حقیقت بھی شعور ہی ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ طبعیاتِ جدید اس نتیجہ کی پُرزور تائید کرتی ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ شعور کی صفات کیا ہیں؟

(جاری ہے)